سید سلیمان ندوی

دبستان شبلی سے تعلیق رکھنے والے ادیبوں میں ایک بہت بڑا نام سید سلیمان ندوی کا ہے۔انہوں نے شبلی کی سوچ اور طرز تحریر کو آگے بڑھایا۔سرسید سے بھی روشنی حاصل کی۔اسی وجہ سے اُن کی تحریر قدیم اور جدید نظریات کا مرقع بن گئی۔اُن کی ذات متنوع حیثیت لئے ہوئے ہے۔بطور سیرت نگار، تاریخ نویس اور خاکہ نگار۔اُن کی سیرت نگاری کے جوہر ''سیرت عائشہ'' اور ''سیرت النبیؐ'' میں بھرے پڑے ہیں۔''مقالات سلیمان'' مؤرخانہ صلاحیتوں کا واضح ثبوت ہے اور خاکہ نگاری میں ''یادرفتگان'' اعلیٰ پائے کی تصنیف ہیں۔ذیل میں چند خاص خاص خوبیوں کا مختصر اُذکر کیا جاتا ہے۔

دلکش اندازبیان: سید سلیمان ندوی نے مشکل سے مشکل فلسفیانہ موضوعات کو بھی اس دلکش انداز میں بیان کیا ہے کہ نہ صرف قاری آسانی سے سمجھ جاتا ہے بلکہ اُس سے لطف اندوز بھی ہوسکتا ہے۔وہ الفاظ کا انتخاب اور استعمال اس انداز سے کرتے ہیں کہ ایک شگفتگی پیدا ہوجاتی ہے۔

روانی: باوجود اس کے کہ سید سلیمان ندوی نے جن موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے وہ بڑے حساس اور مشکل ہیں۔لیکن اُن کی تحریر میں کہیں بھی ٹھہراؤ اور رکاوٹ نہیں اور ایک تسلسل قائم رہتا ہے۔اور کہیں بھی قاری کی دلچسپی کم نہیں ہونے پاتی۔

استدلال: وہ ہر لفظ کو بڑے احتیاط سے رقم کرتے ہیں کہیں بھی کوئی بات بغیر دلیل کے نہیں کرتے۔اسی طرز استدلال نے اُن کی نثر میں وہ شان پیدا کی ہے جو اردو ادب میں چند ہیں لوگوں کو نصیب ہوسکی ہے۔

جامعیت: انہوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے اس کے تمام پہلوؤں تک آپ کی نظر پہنچی ہے۔جو عام نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔اُن کی تصنیف قاری کیلئے بے پناہ معلومات فراہم کرتے ہیں۔یوں لگتا ہے کہ وہ جس موضوع کو بھی ہاتھ لگاتے ہیں اس پر انہیں مکمل عبور حاصل ہوتا ہے۔

جوش وجذبہ: ایک سچا اور پکا مسلمان ہونے کے ناطے انہوں نے دینی معاملات پر خاص طور پر سیرت النبیؐ پر قلم اُٹھایا ہے۔جوش وجذبے کے جوہر نمایاں کردیئے ہیں۔اُن کی تحریروں میں حضور اکرمؐ اور مذہب سے والہانہ محبت کی خوشبو آتی ہے۔

علمیت: اُن کی علمی استعداد کا دائرہ بہت وسیع ہے۔یہی وسعت ان کی تحریروں میں قاری کو مرعوب کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔تاریخ، مذہب، ادب، فلسفہ اور دیگر موضوعات پر انہیں عبور حاصل تھا۔'ارض قرآن' میں اُن کی علمی وادبی خوبیاں اس طرح نمایاں ہیں کہ پڑھنے والے کا آپ کی معلومات اور علمیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

مجموعی جائزہ: مختصراً یوں کہنا پڑتا ہے کہ سید سلیمان ندوی نے جس موضوع پر بھی قلم اُٹھایا تو اُس زمین کو آسمان کردیا۔وہ ہر چیز کا باریک بینی سے جائزہ لینے کا عادی ہے۔اُن کی تحریروں میں سادگی اور سلامت کی بدولت ایک شان پیدا ہوئی ہے۔دوسری طرف اُن کا استدلالی بیان قاری کا مسخر کردیتا ہے۔اُن کی تحریروں کی شان وشوکت عشق رسولؐ کی رہین منت ہے۔سید سلیمان ندوی نے زبان وبیان کے وہ جوہر دکھائے ہیں جو اُن سے پہلے شاید کوئی نہ دکھا سکا۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب، کامیاب مؤرخ اور ماہر عالمِ دین تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ICMS College System

سرسید احمد خان

اردو نثر جس رنگ و روپ میں ہم تک پہنچی اس کاوش میں تین بزرگوں کو خون جگر شامل ہے۔ پہلی مرتبہ میر امن نے اپنی داستان ''باغ و بہار'' کی صورت میں بول چال کی زبان کو ادبی زبان کا رتبہ بخشا۔ بعد میں سرسید نے اصلاح معاشرت کی نیت سے مضامین میں سادگی اور عام فہمی کو رواج دیا۔ تیسرا پڑاؤ غالب کا ہے۔ جس نے سادگی کا وہ انداز متعارف کرایا جس پر ہزار بناؤ سنگھار قربان کیے جا سکتے ہیں۔

سرسید نے چونکہ رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے مضامین کی وساطت سے عوام کو مخاطب کرنا تھا۔ لہٰذا سادگی اور بے ساختگی کو مطمع نظر رکھا۔ ذیل میں سرسید کے اسلوب نگارش کا جائزہ پیش خدمت ہے۔

سنجیدہ خیالات: سرسید نے ہی نثر کو سنجیدہ خیالات اور علمی موضوعات پر اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ سرسید نے ثابت کیا کہ اردو کا دامن اس قدر وسیع ہے کہ اُس میں ہر قسم کے خیالات کا اظہار ممکن ہے۔ چنانچہ انہوں نے مذہب، سیاست، معاشرت، سائنس اور فلسفیانہ مضامین کیلئے اس خوبصورتی کیساتھ اردو کو استعمال کیا کہ اس کے بعد اظہار و بیان کی نئی نئی راہیں کھل گئیں۔

سادگی بیان: نثر کا روزمرہ سادہ بات چیت سے قریب ہونا بڑا ضروری ہے۔ سرسید نے اپنی نثر کو اسی نصب العین پر پورا اُتارنے کی کوشش کی ہے۔ اس میدان میں وہ ایڈیسن اور اسٹیل سے ہم نظر آتے ہیں۔ سرسید نے اردو نثر کو اس قابل بنایا کہ وہ علمی کام کر سکے۔ سادگی، سلاسیت اور روانی کی جو ابتداء غالب سے ہوئی تھی، سرسید نے اُسے مزید ترقی دی۔ مختصراً یہ کہ سرسید کی نظر میں کوئی آرائش نہیں بلکہ اُن کا انداز تحریر فطری ہے۔

مقصدیت: اپنی بات دوسروں تک پہنچانا سرسید کا انداز ہے۔ انہوں نے اپنی نثر سے قومی اصلاح کا کام لیا۔ وہ قوم کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ آپ کے قلم سے لکھا ہوا ہر لفظ مقصدیت لئے ہوئے ہے۔ تہذیب الاخلاق کے اکثر مضامین میں مقصدیت اور تبلیغی رنگ پایا جاتا ہے۔

تمثیلی انداز: مختلف موضوعات اور مقالات میں تمثیلی رنگ اختیار کرنے کا ہنر سرسید کے سر ہے۔ اس سلسلے میں اُن کے مضامین ''اُمید کی خوشی'' اور ''آدم کی سرگزشت'' خاص طور پر نمایاں ہے۔ سرسید نے اردو نثر میں ایک نیا باب کھولا۔ سرسید کا مقابلہ جارج لیمپ کے مضمون ''ڈریم چلڈرن'' سے کیا جا سکتا ہے۔

ظرافت: سرسید میں شوخی و ظرافت کو عنصر بھی پایا جاتا تھا۔ اُن کی تحریروں میں جگہ جگہ ظرافت کے لطافت پائی جاتی ہے۔ لیکن وہ سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ سرسید نے اپنے معاشرے کی بداخلاقیوں اور برائیوں کا دل کھول کر تمسخر اُڑایا۔ اس کی بہتر مثال اُن کے مضمون ''طریق طناول طعام'' میں ملتی ہے۔

استدلالیت: سرسید کے اسلوب کی ایک خاصیت استدلالی انداز ہے۔ انہوں نے اپنی تحریر میں مدلل انداز کا خیال رکھا ہے۔ وہ بغیر ثبوت کے معلومات نہیں پہنچاتا بلکہ اگر وہ کسی دعوے پر دلیل لاتے ہیں۔ تو ایسی قوت کے ساتھ کہ اس سے بہتر کا امکان نظر نہیں آتا۔ جذبات سے اپیل کرتے ہیں تو تاثیر کا خیال رکھتے ہیں۔

محققانہ انداز: سرسید ہر بات کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ آپ قیاس سے پہلو بچاتے ہیں۔ چنانچہ ''آثار الصنادید'' لکھتے وقت عمارتوں کی لمبائی چوڑائی خود معلوم کی۔ اس طرح دیگر مقامات کی معلومات بھی خود دریافت کیں۔ اس طرح ''اسباب بغاوت ہند''، ''آئین اکبری'' یا ''تزک جہانگیری'' میں تحقیقی عنصر کارفرما ہے۔

ICMS College System

زبان پر عبور: سرسید الفاظ کے بے محل استعمال اور قواعد سے بے پرواہ تھے۔ چنانچہ بقول حالی ''وہ تحریر و تقریر میں گرائمر کی پرواہ نہ کرتے''۔ اُن کے ہاں الفاظ کے بے ترتیبی عام تھی۔ سرسید یہ خیال نہ کرتے کہ اُن کی زبان روزمرہ اور محاورہ کے مطابق ہے یا نہیں۔ سرسید متروک الفاظ کا استعمال بھی کرتے۔ اس کے علاوہ انگریزی الفاظ کا غیر ضروری استعمال بھی اُن کے ہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔

مجموعی جائزہ: یہ حقیقت ہے کہ سرسید ہی نے اردو نثر کو ایک وقار بخشا۔ بقول مولوی عبدالحق ''اس زبان کا پستی سے نکالا۔ انداز بیان میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کر دی..... ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعے اردو میں انقلاب پیدا کیا''۔

سچ تو یہ ہے کہ سرسید کا دور ہی اردو نثر میں عہد زرین کہلانے کا مستحق ہے۔ سرسید ساگی تحریر کی ایک تابناک کڑی ہے۔ اور جب تک اردو ادب کا سورج چمکتا رہے گا سرسید کا نام بھی ادبی محافل میں لیا جاتا رہے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ڈاکٹر سید عبداللہ

ڈاکٹر سید عبداللہ ایک صاحب طرز نقاد اور نامور محقق تھے۔ اردو ادب میں ایک نقاد اور محقق کی حیثیت سے ایک بلند مرتبہ رکھتے ہیں لیکن آپ کا اسلوب سب سے نمایاں ہے۔ اردو زبان کے بڑے عالموں میں اُن کا نام سرفہرست ہے۔ اردو کی ترقی اور ترویج کیلئے انہوں نے کئی مضامین تحریر کیئے۔ آپ اردو کا پاکستان میں ذریعہ تعلیم بنانے کی ہمیشہ بھرپور حمایت کرتے رہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ چونکہ ادیب نہ تھے اس لئے ان کے تحریروں میں ادبی اسلوب کی تلاش بے سود ہے۔ البتہ ان کے مضامین اردو زبان کی ترقی اور حمایت میں شائع ہوئے۔ اُن میں بھی زبان و بیان کی خوبیاں موجود ہیں۔

سادہ نثر: سید عبداللہ نے جو کچھ بھی لکھا اس میں بناوٹ اور تصنع کا شائبہ تک نہیں پڑتا۔ وہ مشکل عربی، فارسی الفاظ کے بجائے اردو کے آسان اور عام فہم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے عبارت کو خوبصورت بنانے کیلئے کسی سہارے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بلکہ صاف اور سادہ انداز میں اپنا مفہوم بیان کر دیا ہے۔

اثر انگیزی: ڈاکٹر سید عبداللہ کی تحریروں میں سب سے بڑی خوبی جو دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ اُن کی کہی ہوئی بات دل میں اُتر جانے کا فن جانتی ہے۔ آپ بنیادی طور پر اُستاد ہیں اس لئے تو آپ کی ہر بات دل میں اُترتی ہے۔

اختصار پسندی: وہ اپنی بات کو چند لفظوں میں کہنے کا فن خوب جانتے ہیں۔ انہوں نے کہیں بھی اپنے مفہوم کا بیان کرنے کیلئے بات کو طوالت نہیں دی۔ بلکہ چند لفظوں میں مفہوم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ بات مکمل ہو جاتی ہے۔ وہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا فن جانتے ہیں۔

روانی: آپ کی تحریروں میں ایک ایسی خوبی ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ فنی تسلسل اور روانی کے ساتھ ساتھ اُن کا لہجہ بھی بڑا رواں ہے۔ کہیں بھی قاری مفہوم یا عبارت کو سمجھنے میں بوجھ محسوس نہیں کرتا۔

محققانہ انداز: ڈاکٹر سید عبداللہ کی تحریروں میں ایک محققانہ شان دکھائی دیتی ہے۔ اُن کے مضامین میں ادبی و علمی تحقیق کے انکشافات بھی موجود ہوتے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ بھی تحریر کیا اس پر اُن کو مکمل عبور دکھائی دیتا ہے۔

مجموعی جائزہ: ڈاکٹر سید عبداللہ کے لہجے میں ایک خاص قسم کی نرمی اور دھیمہ پن دکھائی دیتا ہے۔ وہ کسی بھی جگہ اپنی رائے میں ہٹ دھرم نظر نہیں آتے۔ بلکہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد فیصلہ قاری پر چھوڑ جاتے ہیں۔ اُن کے تحریروں میں جہاں سادہ، خوبصورت رشتہ اردو پڑھنے کو ملتی ہے وہاں اُن کی اردو سے محبت بھی جھلکتی نظر آتی ہے۔

ICMS College System

حمید عسکری

پروفیسر حمید عسکری کا اصل میدان ادب نہیں بلکہ سائنس ہے۔لیکن اُن کی قابل قدر خوبی یہ ہے کہ انہوں نے جس زمانے میں سائنسی مضامین کو اردو میں بیان کیا اس طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی تھی۔سائنس پر اُن کی بارہ تصنیفات اردو زبان میں شائع ہوئیں۔جن میں سے ایک کتاب ''جدید آلاتِ جنگ'' کو پنجاب یونیورسٹی سے انعام ملا۔اسی طرح اُن کی تین اور کتابوں کو پاکستان رائیٹرز گلڈ نیشنل بینک ایوارڈ ملے۔اُن کی ایک نمائندہ کتاب ''نامور علم سائنسدان'' ہے۔علاوہ اس کے حمید عسکری صاحب نے قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا ہے۔وہ نہ صرف ایک سائنسدان تھے بلکہ اُن میں ادبی صلاحیتیں بھی موجود تھیں۔جن کا اندازہ اُن کے مضامین کی سادہ زبانی اور فصاحت و بلاغت سے لگایا جا سکتا ہے۔

سادہ اور آسان زبان: حمید عسکری نے سائنس کو اپنے مضامین کا موضوع بنایا۔وہ بنیادی طور پر فزکس کے اُستاد تھے۔لیکن اُن کے مضامین میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ انتہائی سادہ اور آسان ہے۔حالانکہ انہوں نے سائنسی اصطلاح سے بھی کام لیا۔لیکن اُن کی وضاحت بھی بڑے موثر انداز میں کردی ہے۔اُن کی زبان کی خوبی یہ ہے کہ اُن کے مضامین میں قاری کہیں بھی مشکل اور اُلجھن کا شکار نہیں ہوتا۔

تحقیق کا مادہ: حمید عسکری بنیادی طور پر سائنسدان ہے۔سائنس کی تمام بنیادیں تحقیق پر ہیں۔اُن کی تحریروں میں سائنس کی یہ خوبی موجود ہے۔اسی وجہ سے ان کی تحریر میں وہ فصاحت پیدا ہوگئی ہے جو ایک اچھے ادیب کے ہاں ملتی ہے۔

روانی و تسلسل: سائنس جیسے خشک اور دقیق موضوع پر لکھتے ہوئے بھی اُن کی تحریر میں روانی اور تسلسل پایا جاتا ہے۔انہوں نے سائنسی مضامین کو ایک ادبی روانی اور تسلسل عطا کیا ہے۔

مجموعی جائزہ: حمید عسکری کو اردو سے والہانہ محبت تھی۔وہ اردو کو اس قابل بنانا چاہتے تھے کہ تمام سائنس اس زبان میں ترجمہ کی۔اس مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے سائنسی ایجادات اور تجربات کو عام فہم بنانے اور اُن کا بہتر ابلاغ کرنے کیلئے اردو کو ذریعہ زبان بنایا۔اُن سے قبل انگریزی زبان کو ہی یہ خصوصیت اور اہمیت دی جاتی تھی۔حمید عسکری کے اسلوب میں ادبی شان و شوکت اور ندرتِ بیان، تخیلات، تخیل اور جذبہ تو موجود نہیں لیکن سادگی، فصاحت، علمیت اور روانی بدرجہ اتم موجود ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

پریم چند

جس طرح میرؔ دنیائے غزل میں منفرد ہیں اسی طرح پریم چند دنیائے افسانہ میں یگانہ روزگار سمجھے جاتے ہیں۔انہوں نے اردو نثر میں مختصر افسانے کے فن کا چراغ روشن کیا۔ان سے قبل افسانے تو لکھے گئے تھے لیکن وہ صرف داستان کے بدلے ہوئے روپ تھے۔پریم چند نے سب سے پہلے فنی لحاظ سے کامیاب افسانے لکھے۔اور اردو افسانہ نگاروں کو مختصر افسانے کے فن سے روشناس کرایا۔پریم چند نے ایک عہد آفرین شان کیساتھ افسانے کے میدان میں قدم رکھا اور ادب و زندگی کے رابطے کو زبردست فنی مہارت کیساتھ نمایاں کر کے اردو افسانہ نگاری میں انقلاب پیدا کر دیا۔

اصلاحی رجحان: پریم چند کی تحریروں میں ایک خاص مقصدیت ہے۔اُن کے نزدیک ادب کا سب سے بڑا فریضہ مسائل زندگی کا حل نکالنا ہے۔اس لئے اُن کے افسانوں میں ہندو مسلم فسادات، کاشتکاروں کی حالت زار، زمینداروں اور ساہوکاروں کے مظالم، جنگ آزادی، بازاری عورتوں کی اصلاح وغیرہ کے موضوعات عام ہیں۔وہ غلط رسم و رواج کی پابندیوں کے خلاف ہیں اور اخلاقی درس دیتے ہیں۔لیکن پریم چند نے فکر کے ساتھ ساتھ فن کا بھی خیال رکھا۔اُن کے افسانے فنی لحاظ سے بلند ہیں۔اس حوالے سے نمائندہ افسانے ''کفن''، ''صرف ایک آواز''، ''خونِ سفید''، ''سوا سیر گیہوں''، وغیرہ۔

ICMS College System

مقامی رنگ: یہ ایک نمایاں خاصیت ہے۔ بقول آل احمد سرور ''وہ ہندوستان میں بیٹھ کر ایران وتہران کی باتیں نہیں کرتے بلکہ یہیں کے مال سے دکان سجاتے ہیں۔'' اسی خاصیت کی بنا پر ان کی تحریروں کے اپنے دور کی تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ اُن کے افسانے اور ناول ہندوستانی عوام اور اُن کی زندگی سے متعلق دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔

دیہاتی زندگی کی عکاسی: پریم چند کا خاص میدان دیہاتی زندگی تھا۔ انہوں نے اپنے گہرے مطالعے کی بدولت افسانوں میں ایک دنیا آباد کی تھی۔ انہوں نے غریب کسانوں اور مزدوروں کے حالات کا بغور مطالعہ کیا۔ اس لئے جو کچھ کہتے ہیں وہ نہایت حسین اور فطری ہوتا ہے۔ عام لوگوں کی بے بسی کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دل بھر آتا ہے۔ انہوں نے دیہاتی لوگوں کی درماندگی پر خون کے آنسو بہائے ہیں جو خون جگر سے کھیتوں کو سینچتے ہیں۔ مگر کھلیان بھرنے کے بعد خود دامن جھٹک کر رہ جاتے ہیں۔ اور مہاجنوں کا گھر غلہ سے بھر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں علی عباس حسینی لکھتے ہیں، ''پریم چند دیہاتی زندگی کی ایسی عکاسی کرتے ہیں کہ اُن کے افسانوں سے گوبر کی بو آتی ہے''۔

حقیقت نگاری: عموماً افسانہ اور حقیقت کے درمیان فرق نظر آتا ہے لیکن پریم چند کے افسانوں میں واقعیت نظر آتی ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں، ''افسانے میں سب کچھ سچ ہوتا ہے سوائے نام اور تاریخ کے اور تاریخ میں سب کچھ جھوٹ ہوتا ہے سوائے نام اور تاریخ کے''۔

انہوں نے اپنے دور کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے حالات وواقعات کو افسانوں میں جگہ دی۔ وہ ہر چیز کو ایک حقیقت پسند کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کے بعد اپنے مخصوص انداز میں پیش کرتے ہیں۔ سادہ اور شیریں وہونے کی وجہ سے قبول عام کا شرف حاصل کر چکی ہے۔ اپنی عام فہم زبان ہے کہ صفائی اور چستی نمایاں ہے۔ ان کی ہاں رعایت لفظی کی نظامت بھی ہے۔ حسن نظامی کو دہلی کے روزمرہ اور محاورے کے استعمال پر پوری قدرت حاصل ہے۔ ان کی تحریر میں بے ساختگی بھی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

پطرس بخاری

احمد شاہ پطرس بخاری اردو انگریزی کے قادر الکلام انشاء پرداز، بلند پایہ نقاد اور کامیاب مترجم تھے۔ لیکن انہیں ''پطرس کے مضامین'' کے مجموعہ کی بدولت اُن کا شمار اردو کے ممتاز ترین مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔

پطرس نے اردو مزاح نگاری میں ایک نیا انداز اور اسلوب اختیار کیا۔ انہوں نے مزاح نگاری میں جو پھکڑ اور عامیانہ پن پایا جاتا تھا اُس کو چھوڑ کر خالص مزاح کو اپنایا ہے۔ جس میں واقعہ، کردار، مبالغہ اور پیروڈی کے ذریعے مزاح کا رنگ بھرا جاتا ہے۔ ذیل میں پطرس کی مزاح نگاری کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

خالص مزاح: پطرس کے مضامین کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ اُن کا اصل مقصد تفریح کا سامان مہیا کرنا نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے اُن کا ہمدردانہ جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ گویا اُن کا مزاح صحت مندانہ کیفیت کا حامل ہے۔ پطرس مریض کو کچھ لے دے کر نہیں ہنستے بلکہ گلے سے لپٹا کر قہقہے لگاتے ہیں۔ جس میں خلوص اور کشادہ دلی نمایاں ہے۔

لطیف طنز: طنز کی تیزی اور شدت کو کم کرنے کیلئے پطرس نے زیادہ تر تحریروں میں اپنی ذات کو نشانہ بنایا ہے۔ مثلاً ''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی'' ''میں ایک میاں ہوں''، ''مرحوم کی یاد میں''، ''میبلی اور میں'' میں وہ خود ہی مذاق کا نشانہ مجبور بنے۔ پطرس معمولی معمولی باتوں میں مزاح کا پہلو نکال لیتے ہیں اور نہ صرف خود ہنستے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی ہنساتے ہیں۔

ICMS College System

موازنہ: مزاح نگاری میں کردار، واقعہ اور سٹائل کے ساتھ دو چیزوں میں موازنہ مشابہت اور تضاد پیدا کر کے مزاح پیدا کیا گیا ہے۔ پطرس بھی اس حربے سے کام لیتے ہیں۔ اُن کا مضمون ''کتے'' اس کی بہترین مثال ہے۔

پلاٹ: پطرس قاری کا پلاٹ میں نہیں اُلجھاتے اور نہ اجنبی کرداروں میں گم کر دیتے ہیں بلکہ نہایت خوبصورتی سے زندگی کے واقعات کو پیش کرتے ہیں۔ پطرس جو آئینہ تخلیق کرتے ہیں اُس میں ہمیں اپنی حماقتوں کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

کردار نگاری: پطرس نے کردار نگاری میں ایک ماہر نفسیات کا کمال دکھایا ہے۔ انہوں نے انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انسانی حرکات وسکنات، گفتگو، جذبات واحساسات غرض کوئی پہلو اُن سے پوشیدہ نہیں تھا۔ اُن کے کردار ہمارے معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کی حماقتیں بیان کر کے پطرس ہمارے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔

پیروڈی (تحریف): پیروڈی ایسی لفظی اُلٹ پھیر کا نام ہے جس سے کسی کلام یا تصنیف کی تضحیک ہو سکے اور نئے معنی پیدا ہو جائے۔ اردو میں سب سے پہلے پطرس نے پیروڈی کو اپنایا۔ اُن کی پہلی کوشش، ''اردو کی آخری کتاب'' ہے۔ جو محمد حسین آزاد کی درسی کتاب ''اردو کی پہلی کتاب'' کی پیروڈی ہے۔ پطرس بعض اوقات کسی شعر کی پیروڈی کرتے ہیں۔

کہوں کس سے کہ کیا ہے سگِ راہ بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

زبان وبیان کی خوبیاں: پطرس کی تحریر میں زبان وبیان کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ سادگی، صفائی، اختصار، محاورات، روانی اور شگفتگی میں وہ اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ اُن کی شگفتگی نے معمولی باتوں میں بھی جان ڈال دی ہے۔ وہ قاری سے بے تکلف بات کرتے ہیں۔ وہ ہر بات کو سادگی سے بیان کرنے کے عادی ہیں۔

واقعات سے مزاح پیدا کرنا: پطرس اکثر صورتِ واقعہ سے کام لیتے ہیں۔ یہ مزاح کسی واقعہ یا کردار کی مخصوص ناہمواری سے پیدا ہوتا ہے۔ جس کے نتائج غیر متوقع نکلتے ہیں۔ صورتِ واقعہ کی بدولت بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ مثلاً ''مرحوم کی یاد میں'' میں سائیکل کے ٹائر میں پیوند لگا ہے۔ جس کی وجہ سے سائیکل روانہ ہونے کے بعد پطرس کو جھٹکے لگتے ہیں۔ اس کی مثال پطرس نے کچھ یوں دی ہے، ''ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو''، ''مرید پور کا پیر''، ''مرحوم کی یاد میں'' اور ''سویرے جو کل میری آنکھ کھلی'' میں انہوں نے واقعہ نگاری کے ذریعے سے مزاح تخلیق کی ہے۔

مجموعی جائزہ: پطرس کی زبان سادہ اور دلکش ہے۔ پطرس نے ہر وہ حربہ آزمایا ہے جس کی بدولت وہ قاری کو تھوڑی دیر کیلئے زندگی کی پریشانیوں سے نکال سکے۔ مختصر یہ کہ پطرس اردو نثر میں خالص مزاح کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کی بدولت پطرس نے صرف 11 مضامین کی بدولت وہ ممتاز مقام حاصل کیا ہے جن کی بنا پر ادب کے محافل میں اُن کا نام مدتوں یاد رکھا جائے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ICMS College System

شوکت تھانوی

شوکت تھانوی بذات خود ایک ادارہ تھے۔وہ بیک وقت نثر نگار، ناول نگار، صحافی، ڈرامہ نگار اور شاعر تھے۔طنز و مزاح میں ابھی انہیں ایک خاص مقام حاصل ہے۔شوکت تھانوی نے زندگی کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا۔اور انسانی کمزوریوں پر افسردہ ہونے کی بجائے اُن میں دلچسپی کا سامان تلاش کیا۔اُن کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہم کسی بے تکلف دوست سے باتیں کر رہے ہیں۔دراصل اُن کی ظرافت ہنسانے کا ایک سلیقہ ہے جو صرف اُسی کا خاصہ ہے۔

مزاح نگاری: یوں تو مزاح نگاری کی تاریخ خاصی پرانی ہے۔مگر دوسرے مزاح نگاروں سے شوکت تھانوی کو یہ بات ممتاز کرتی ہے کہ اُن کی مزاح میں طنز کی شدت بھی محسوس ہوتی ہے۔شوکت تھانوی کا مقصد تاری کو وقتی طور پر پریشانیوں سے نکال کر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرنا تھا۔وہ بلکی پھلکی باتیں کرتے ہیں۔گہرے مسائل سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔وہ محض زبان کی چاشنی سے مزاح کا عنصر پیدا کرتے ہیں۔زبان و بیان ہی اُن کی مزاح نگاری کی پہچان ہے۔

طنز بطور اصلاح معاشرت: شوکت معمولی واقعات کو بڑے ظریفانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔رسم و رواج اور سماجی کمزوریوں کے مضحکہ خیز پہلوؤں پر اُن کے تبصرے بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔شوکت فطری طور پر مزاح نگار ہیں مگر وہ روزمرہ زندگی کے تضادات پر بڑے لطیف انداز میں طنز کرتے ہیں۔اُن کا مزاح صرف خوشدلی تک محدود نہیں بلکہ وہ اس سے معاشرہ کی اصلاح کا کام لینا چاہتے ہیں۔

کردار نگاری: شوکت کے کردار درمیانہ طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں لیکن ان کا انداز بیان اُن کی پریشانی میں دلچسپی کا سامان فراہم کرتا ہے۔شوکت کی ظرافت اُن کی طرز تحریر کی مرہونِ منت ہے۔وہ واقعات کی بجائے فقروں کے کھیل سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔مزاحیہ مضامین کے علاوہ انہوں نے بعض شخصیتوں کی سیرت پر بھی مضامین لکھے ہیں جو کتابی شکل میں ''شیش محل'' اور ''قاعدہ وہ بے قاعدہ'' کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ان کے علاوہ شوکت کو جس چیز نے زیادہ شہرت دی وہ اُن کا کردار ''قاضی جی'' ہے۔

طرزِ تحریر: شوکت تھانوی کی زبان بہت سادہ، عام فہم اور شگفتہ ہے۔اُن کی تحریر میں بلا کی روانی ہے۔وہ اپنی علمیت کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ واقعات کو ایسی ترتیب اور ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ سنجیدہ شخص بھی زیرِ لب مسکراتا ہے۔یہی اُن کی کامیابی کا راز ہے۔اور اسی وجہ سے اُن کی تحریروں کو عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔

عملی و واقعاتی مزاح: شوکت عملی مزاح پیدا کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔گردوپیش میں جو کچھ نظر آئے اور جو واقعات رونما ہوں، اُن میں شوکت اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر ہنسانے کا پہلو نکال لیتے ہیں۔دیکھی بھالی چیزوں اور معمولی بات پر مسکرانے کے ہنر نے پڑھنے والوں کو اُن کا گرویدہ بنا دیا۔یوں تو وہ کہیں کہیں کرداروں کے حرکات پر بھی ہنستے اور ہنساتے ہیں اور بعض اوقات معاشرتی ناہمواریوں کو بھی قلم کی زد پر لاتے ہیں لیکن حقیقت میں اُن کا تعلق اُس جماعت سے ہے جو عملی مزاق سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔

مجموعی جائزہ: شوکت کی تحریر میں اگرچہ وہ نفاست اور شگفتگی نہیں جو رشید احمد صدیقی کا حصہ ہے۔اُن کی ظرافت میں وہ مغز بھی نہیں جو پطرس کی ظرافت کی جان ہے۔لیکن اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر شوکت مزاح نگاری میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔مختصر یہ کہ آج اردو ادب میں طنز و مزاح جس خاص نکھار، دلکشی اور رعنائی سے جلوہ گر ہے اور ظرافت میں بھی ادبی رنگ نظر آتا ہے اس میں شوکت تھانوی کی کوشش و کاوش کا بڑا حصہ ہے۔بقول عشرت رحمانی ''حقیقت یہ ہے کہ زندہ دلی کی ایک دلکش اور نفیس حادثہ کا نام شوکت ہے۔''

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ICMS College System

احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی ایک عظیم شاعر اور کالم نویس بھی ہیں اور اعلیٰ افسانہ نگار بھی۔ وہ جدید سیاسی تحریکات سے متاثر ہوئے۔ اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ اُن کے ہاں طبقاتی ناہمواریوں اور استحصال کے خلاف شدید ردِعمل ملتا ہے۔ وہ دورِ جدید کے رجحانات کے صحیح معنوں میں علمبردار ہیں۔ قاسمی نے دیہات کے افسانے لکھ کر قومی خدمت کی۔ لیکن اور خدمت یہ ہوئی کہ اردو کے بہت سے لکھنے والوں نے دیہات کی زندگی کو افسانوں کا موضوع بنایا۔ اس لحاظ سے دیہاتوں کے سب سے بڑے نقاش اور مصور قاسمی ہیں۔ اُن کے افسانوں میں پنجاب کے دیہاتوں کی عمدہ تصویر نظر آتی ہے۔ پریم چند کی طرح انہوں نے دیہاتی زندگی کے مختلف مسائل اور وہاں کا ماحول، دیہاتوں کی صاف پُرخلوص زندگی محبت پیار اور قربانی و ایثار کے جذبے کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اُن کے افسانوں میں پنجاب میں پلنے بڑھنے، کام کرنے والے دیہاتی اپنی بے تکلفی کیساتھ نظر آتے ہیں۔ مناظر کی عداسی بڑی دل کش ہوتی ہے۔ نیز ان مناظر میں یکسانی نہیں بلکہ تنوع ہے۔ پنجاب کی سماجی زندگی اور ماحول تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔

قاسمی نے پنجاب کے دیہاتوں کو اچھی طرح دیکھا بھالا ہے۔ انہیں اس زندگی کے سارے پہلوؤں سے گہری واقفیت ہے۔ دوسری طرف اُن کی نظر ان چیزوں تک بھی پہنچی ہے جو نیا زمانہ اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اور زندگی کی اوپری سطح اس کا اثر قبول کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

قاسمی کے ابتدائی افسانوں کے مجموعے درودیوار، سناٹا، آس پاس زیادہ تر پنجاب کی دیہاتی زندگی اور تقسیم سے متعلق ہیں۔ لیکن انہوں نے دیہاتی انسانوں کے علاوہ بہت سے افسانے شہری زندگی کے بھی لکھے ہیں۔ شہری زندگی کے ان گوناگوں افسانوں میں ہمیں بہت سی باتیں نظر آتی ہیں۔ شہری غلاظت، غریب، مشین اور دھواں، بیماریاں اور سب سے بڑھ کر تصنع اور بناوٹ "گھر سے گھر تک" ایسے ہی تصنع کی عکاسی کرتا ہے۔ اور ہماری معاشرتی زندگی کے اس پہلو پر طنز ہے۔

قاسمی کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا شاعرانہ انداز ہے۔ قاسمی اپنی تحریروں میں ہمیشہ توجہ اور کاوش سے کام لیتے ہیں۔ شاعری کی زبان میں جسے خونِ جگر کہتے ہیں۔ خونِ جگر کی یہ سرخی ہمارے موجودہ دور کے افسانہ نگاروں میں کسی نے اتنے خلوص اور توازن کیساتھ صرف نہیں کی جتنی ندیم نے اور اسی لئے ان کا ہر افسانہ فن کا بڑا حسین مرقع ہے۔

مجموعی جائزہ: احتشام حسین لکھتے ہیں، "احمد ندیم قاسمی افسانہ نگاروں کی پہلی صف میں ایک منفرد جگہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے مسلسل اچھے افسانے لکھے اور اس وقت تو مشکل ہی سے اُن کا کوئی ایسا افسانہ ہوگا جو دامنِ دل کو نہ کھینچتا ہو جن کو شعور موضوع کی بصیرت، مواد پر قدرت، تنوع اور فنکار کے گداز دل۔ کسی حیثیت سے بھی دیکھا جائے وہ ایک مکمل افسانہ نگار ثابت ہوتے ہیں"۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غالب کی نثر نگاری

غالبؔ نے جس طرح اردو شاعری میں اپنے لئے ایک الگ راہ نکالی اسی طرح اردو نثر میں بھی وہ ایک خاص طرز کے مؤجد تھے۔ وہ ایک عظیم شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک نثر نگار کی حیثیت سے بھی اُن کی عظمت مسلمہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے نثر کی طرف باقاعدگی کیساتھ توجہ نہیں دی لیکن اس کے باوجود نثر کی جو روایت انہوں نے قائم کی وہ اپنی جگہ منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ دراصل غالب نے غزل کی طرح خط کو بھی ایک ادبی مشغلہ بنا لیا تھا۔ اور اسی شوق میں وہ پکار اُٹھے تھے۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے، جواب میں

ICMS College System

مرزا نے جب اردو میں خط لکھنے شروع کیئے تو اس سے پہلے اردو نثر کے دو مستقل اسلوب موجود تھے۔ایک سادہ اور دوسرا دقیق جو فارسی کے طرز کا پرتو تھا۔ خط نگاری میں عموماً نمائش اور علمیت پر زور دیا جاتا تھا۔مرزا نے سادہ اور سلیس انداز اختیار کیا۔اُن کی باتوں میں تکلف اور بناوٹ نہیں۔بلکہ اپنے خیال کو براہ راست الفاظ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ذیل میں اسی گفتگو کو چیدہ چیدہ نکات کی صورت میں آگے بڑھاتے ہیں۔

بے تکلفی اور سادگی: مرزا غالبؔ کے انداز تحریر کی ممتاز ترین خصوصیت بے تکلفی اور سادگی ہے۔غالب کے انداز میں سادگی اور پُرکاری دونوں نمایاں ہے۔سادگی اور بے تکلفی کے باوجود تحریر میں دلکشی ہے۔مثلاً مہدی مجروح کو لکھتے ہیں، ''ہاں صاحب! تم کیا چاہتے ہو، تم ہم عمر نہیں جو سلام لکھوں، میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں، تمہارا دماغ چل گیا ہے لفافے کو کریدا کرو۔''

جدت: غالبؔ کی تحریر کی دوسری خصوصیت جدت ہے۔جو کہ اُن کے نثر کی جان ہے۔وہ عامیانہ اور فرسودہ بات لکھنے کے شوقین نہیں۔وہ تقریباً ہر خط میں مکتوب الیہ کو نئے طریق پر خطاب کرتے ہیں۔مثلاً میر مہدی مجروح کو بھائی، نورِ چشم، برخوردار، صاحب، میاں، میری جان، میاں لڑکے وغیرہ کے القاب سے مخاطب کرتے ہیں۔

شوخی و ظرافت: غالبؔ مزاجاً بڑے ظریف تھے۔حالیؔ نے انہیں، ''حیوانِ ظریف'' کہہ کر پکارا ہے۔جب کوئی دلچسپ واقعہ بیان کرنا ہوتا تو مرزا انہیں اپنے انداز سے اور بھی دلچسپ بنا دیتے۔غالب کی یہ کوشش ہوتی کہ کسی طرح مکتوب الیہ کو خوش کیا جائے۔مثلاً موسم برسات میں چھت کی حالت کا بیان یوں ہے، ''چھت چھلنی ہے۔ابر اگر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے''۔ ناقت کو یوں لکھا ہے، ''آج میرے پاس ٹکٹ ہے نہ دام معاف رکھنا والسلام''۔

بالمشافہ گفتگو کا رنگ: مرزا نے تحریر میں بات چیت کا انداز پیدا کر لیا تھا۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالب اپنے دوست کے سامنے بیٹھ باتیں کرتا ہے۔مثلاً ایک دوست کو لکھتا ہے، ''میاں لڑکے کہاں پھرتے ہو ادھر آؤ خبریں سنو''۔ ایک اور دوست کو مکالمت کا انداز دیکھئے، ''آہا میر اپیارا مہدی آیا کیسے ہو''

القابات و آداب: مرزا سے پہلے لمبے لمبے القابات لکھنے کا رواج تھا۔مرزا نے یہ فرسودہ طریقہ رد کر دیا۔وہ خط کو کبھی میاں، برخوردار یا بھائی سے شروع کر دیتے۔مرزا کبھی کبھی خط کا بغیر اس کے قسم کے القابات کے شروع کر دیتے۔

تاریخی اہمیت: غالب کے خطوط اپنے دور کی تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔جنگ آزادی کے بعد کے واقعات سے اُن کے خطوط بھرے پڑے ہیں۔دلی کی تباہی و بربادی اور مسلمانوں کی بے بسی کا رونا رویا گیا ہے۔آپ کے خطوط شہر آشوب کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ان خطوط میں دلی پر قبضہ، مسلمانوں کا گرانا، نایاب کتب کا جلانا اور عزیزوں کا بچھڑ جانا جیسے حوادث کا ذکر ملتا ہے۔

ذاتی حالات کی عکاسی: غالب کے خطوط کی ایک خصوصیت میں غالب چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔بلکہ جو کچھ اُن پر بیتی، جو کچھ انہوں نے محسوس کیا سب کی تفصیل موجود ہے۔ان خطوط کو ترتیب دینے سے مرزا کی خودنوشت سوانح عمری مرتب ہو سکتی ہے۔

مجموعی جائزہ: اردو نثر میں غالب کے خطوط کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔یہ غالب کا اردو نثر میں کارنامہ ہے۔کہ انہوں نے مشکل انداز بیان ترک کر کے سادہ اور روزمرہ کی زبان کو اپنایا۔غالب کے خطوط میں طنز و مزاح بھی ہے اور سنجیدگی بھی۔نہ صرف اُن کے ہمعصر ادیبوں بلکہ بعد میں آنے والے نثر نگاروں نے بھی غالب کا انداز اپنایا۔اور رفتہ رفتہ یہی اسلوب تحریر عام ہو گیا۔لطف کی بات یہ ہے کہ بغیر کسی ادبی غرض کے لکھے گئے یہ خطوط غالب کیلئے وجہ شہرت بن گئے۔لہٰذا ان خصوصیات کی بنا پر ہم مرزا کو جدید اردو نثر کا بانی کہہ سکتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ICMS College System

غلام عباس

غلام عباس جدید افسانہ نگاروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ اور اُنہیں اُس صف میں شمار کیا جا سکتا ہے جس میں کرشن چندر، بیدی، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی اور منٹو جیسے سر کردہ افسانہ نگار نظر آتے ہیں۔ غلام عباس کے افسانوں میں ترقی پسندانہ رجحانات ملتے ہیں۔ اُن کا شمار اُن افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے زندگی کی صداقت اور فن کی لطافت کو شیر و شکر کر کے افسانے کی روایت کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اُس میں شخصیت کا رنگ بھر کر اُس کو آگے بڑھایا۔

حقیقت نگاری: غلام عباس اپنی افسانہ نگاری کے بارے میں خود لکھتے ہیں ''انہوں نے ابتداء میں افسانہ نگاری عبدالحلیم شرر اور رتن ناتھ سرشار کی کتابوں کے مطالعے سے شروع کی۔ اس لئے ابتداء میں رومانی افسانے ''محبت کا گیت'' اور ''مجسم'' لکھے۔ لیکن شعور کی پختگی کے بعد چیخوف موپسیاں اور گورکی وغیرہ کے افسانوں نے متاثر کیا۔ یہ سب حقیقت نگار تھے''۔ اسی حقیقت نگاری کی وجہ سے اُن کے افسانوں میں معاشرے کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔

موضوعات: غلام عباس اپنے افسانہ کا موضوع تلاش کرنے کے بعد اُس پر غور کرتے ہیں۔ وہ کسی بھی موضوع پر اُس وقت تک قلم نہیں اُٹھاتے جب تک وہ موضوع فکر اور جذبہ کی بھٹی میں تپ کر کندن نہ بن جائے۔ اُن کی کہانیاں عدم توازن کا شکار نہیں ہوتیں۔ اُن کی زبان صاف ستھری ہے اس سلسلے میں نمائندہ افسانے یہ ہیں۔ آنندی، کتبہ، ہیئر کٹنگ سیلون، سایہ، اور اوورکوٹ وغیرہ۔ غلام عباس کے موضوعات متنوع ہیں۔ زندگی کی ہر راہ پر اُن کی نظر پڑتی ہے۔ اور اس طرح اچانک اُسے ایک موضوع مل جاتا ہے۔

ICMS College System

مشاہدہ اور جدت: غلام عباس زندگی کا گہرا مشاہدہ اور تجربہ رکھتے ہیں۔ اور اپنے تجربات اور مشاہدات کو سیدھے سادے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ اُن کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ہمارے گرد و پیش میں ایسی دلچسپیاں تھیں جن تک ہماری نظر نہیں گئی۔ اب اُن کے مشاہدہ کی بدولت ہم زندگی کے بعض بے کیف گوشے بھی حسین صورت میں دیکھتے ہیں۔ غلام عباس کے بقول واقعات بیان کرنے سے افسانہ تخلیق نہیں ہوتا۔ بلکہ زندگی کا کوئی پہلو ضرور مدِ نظر ہونا چاہیے۔ یوں غلام عباس جدت سے کام لیکر نت نئے حالات واقعات سے ہمیں روشناس کراتے ہیں۔ آنندی اور کتبہ اسی قسم کے افسانے ہیں۔

کردار نگاری: غلام عباس نے اپنے افسانوں میں جیتے جاگتے کردار تلاش کیئے ہیں۔ لیکن یہ کردار معاشرے کے ہر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں برے بھی ہیں اور اچھے بھی۔ غلام عباس کے نزدیک جس کی بنیاد پر ایک افسانے کی بنیاد رکھی جا سکے اب وہ معاشرہ کا اچھا انسان بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی۔ مختصر یہ کہ اُن کے کردار شاہکار حیثیت کے حامل ہیں۔

مجموعی جائزہ: بقول اختر حسین رائے پوری، ''غلام عباس کا شمار بجا طور پہ افسانہ نگاروں کے صفِ اول میں ہوتا ہے۔ اور ان کی حیثیت مسلم ہے۔ اُن کے فن میں معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے۔ جس کی مثال عہدِ حاضر کے اردو ادب میں کم ملے گا''

غلام عباس کے افسانوں میں فن اور فکر کا حسین امتزاج ملتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

شعراء کے تنقیدی جائزے

میر تقی میرؔ (1722ء تا 1810ء آگرہ)

میر تقی میرؔ اردو کے ایک عظیم شاعر ہیں۔ بقول عبدالحق میر تقی میرؔ سرتاج الشعرائے اردو ہیں۔ اُن کا کلام اُسی ذوق سے پڑھا جائے گا جیسا کہ فردوسی کا کلام فارسی میں ..... جنہوں نے اپنے کمال سے اردو کی فصاحت کو چمکایا اور زبان کو زندہ رکھا۔ اُن کا احسان اردو زبان پر تا قیامت رہے گا۔'' میر کی عظمت کے اعتراف میں غالب یوں فرماتے ہیں۔

؎ ریختہ کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

یوں تو میرؔ نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن غزل میں اُن کا مرتبہ نہایت بلند ہے۔ احساس کی شدت، خلوص و صداقت، سوز و گداز، مضامین کی جدت، زبان کی شیرینی اور مشاہدے کی وسعت وہ خصوصیات ہیں جنہوں نے یکجا ہو کر میر کی شاعری کو عظمت عطا کر دی ہے۔

خلوص و صداقت: میرؔ نے زندگی کے واقعات کو جس طرح محسوس کیا اسی طرح ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ اس لئے اُن کی شاعری میں خلوص و صداقت کا عنصر نمایاں ہے۔ میرؔ کی شاعری سچے جذبات کی ترجمانی ہے۔ وہ سادہ الفاظ میں اپنا جذبۂ دل بیان کرتے ہیں۔

؎ مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
دردو داغ کتنے کیئے جمع تو دیوان کیا

سوز و گداز: میرؔ کے کلام کا ایک بڑا معیار کلام کی تاثیر ہے۔ اُن کے اشعار میں سوز و گداز اور درد و غم کی تصویریں ہیں اُن کے الفاظ دل میں اُتر جاتے ہیں۔ میرؔ سراپا حسرت و یاس تھے۔ یہ جھلک شاعری میں نمایاں ہے۔

؎ ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
جو دیکھوں تو آنکھوں سے لہو بہے
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
جو نہ دیکھوں تو جی پر قیامت رہے

دلآویز لب و لہجہ: میرؔ کی شاعری میں باتوں کا انداز ملتا ہے۔ دل کے خیالات کو جو سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں۔ محاورے کا رنگ دیکر باتوں باتوں میں ادا کر جاتے ہیں۔

؎ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
کہتا ہے میرؔ کے بے اختیار رو
اُس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے
ایسا تو رو کہ رونے پر تیری ہنسی نہ ہو

اشاریت: میرؔ کے کلام میں رمز و ایمائیت ہے۔ وہ مشکل سے مشکل مضمون کو چند لفظوں میں خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں۔ بعض الفاظ میں ایک جہاں معنی پوشیدہ ہے۔

؎ کہا میں نے گل کو ہے کتنا ثبات
شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
دل ہے گویا چراغ مفلس کا

ICMS College System

ندرتِ ادا: میرؔ عام باتوں کے اظہار کیلئے نادر پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ ندرت سے تشبیہ و استعارہ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً

؎ نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے ؎ کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے

پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

سہل ممتنع: سہل ممتنع سادگی اور حسن بیان کی اس صنعت کو کہتے ہیں جسے دیکھ کر ہر شخص سمجھے کہ یہ تو میرے دل کی بات ہو رہی ہے۔

فصاحت الفاظ: میرؔ تصحیح الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف فارسی اور اردو الفاظ کے ذخیرے تک اپنے آپ کو محدود رکھا بلکہ فارسی کی عمدہ ترکیبیں اور ہندی کے شیریں الفاظ بھی استعمال کیے۔ مثلاً

؎ صبح سے شمع سر کو دھنتی رہی ؎ فقیرانہ آئے صدا کر چلے

کیا پتنگے نے التماس کیا میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

موسیقیت: علاوہ ازیں میرؔ موسیقیت اور ترنم کا خاص خیال رکھتے ہیں اس مقصد کیلئے وہ قافیے اور بحریں مترنم لاتے ہیں۔ ان کے علاوہ ردیف کی تکرار سے بھی عمدہ کیفیت پیدا کرتے ہیں۔

؎ سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو

ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

دردمندی: میرؔ کے کلام کی اہم خصوصیت اُن کا جذبہ دردمندی ہے۔ جو اُن کے ذاتی اور اجتماعی حالات کا نتیجہ ہے۔ یتیمی کا صدمہ، عزیزوں کی بے اعتنائی عشق میں ناکامی، زمانے کی ناسازگاری۔ ان باتوں نے اُن کو متاثر کیا۔

؎ روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات ؎ اب وہ عشق سے تو واقف نہیں ہے لیکن

اب یہی روزگار ہے اپنا سینے میں جیسے دل کا مَلا کرے کوئی

میرؔ کی غزل کا سب سے اہم اور مرکزی مضمون غم ہے۔ مگر انہوں نے غم انگیز تجربات کی تصویر کشی ایسے انداز سے کی ہے کہ بیزاری اور مایوسی پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ زندگی سے لگاؤ برقرار رہتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جس نے میرؔ کی شاعری کو قبولیت کا اعجاز بخشا ہے وہ ہے زبان و بیان کی خوبیاں جس کی عظمت کا اعتراف ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے۔ اور بعد میں آنے والے شعراء اور عام قاری حضرات اُن کی شاعری کو اس طرح خراج تحسین دیتے رہیں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ICMS College System

داغ دہلوی

داغ کی زندگی تفکرات سے آزاد رہی۔ اس لئے کلام میں سوز و گداز کا عنصر ناپید ہے۔ کوئی فلسفہ نہیں۔ اس کے بجائے ایک خاص قسم کی شوخی طنز چھیڑ چھاڑ کا ذکر ملتا ہے۔ بعض جگہ تو وہ فحاشی اور ابتذال کی حدود کو چھو لیتے ہیں۔ اس کے باوجود اردو غزل کی روایت میں داغ کا ایک بلند مقام ہے۔ انہوں نے شاعری کے ایک دور کو متاثر کیا۔ حسب ذیل خصوصیات نمایاں ہیں۔

زبان: کلام داغ کی سب سے نمایاں خوبی زبان ہے۔ صرف اسی خوبی کی وجہ سے داغ زندہ ہے۔ موسیقیت آمیز توازن، سادگی اُن کی زبان کی نمایاں خوبی ہے۔

؎ راہ میں ٹوکا تو جھنجھلا کر بولے ؎ کہتے ہیں اسے زبان اردو

دور رہو کم بخت یہ بازار ہے جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

لب ولہجہ: داغ کی شاعری میں لب و لہجے کی سادگی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ انداز بیان، طرز ادا، کلام کی روانی اور آہنگ سبھی کچھ شامل ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں سے ہر ایک لب ولہجہ کی کوئی نہ کوئی نمایاں خوبی لئے ہوئے ہیں۔

؎ اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمہارا کیا ہے ؎ ہجر کی یہ کیسی رات ہے

آنکھ نرگس کی، غنچہ دہن کا حیرت میری ایک میں ہوں اور خدا کی ذات ہے

روزمرہ اور محاورات: داغ نے اپنی شاعری میں روزمرہ بول چال اور محاورہ کا خاص خیال رکھا ہے۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہے کہ شاعری کے تیور ان کی زبان ہی سے بنے ہیں۔ روزمرہ اور محاورہ ان کے کلام کے حسن میں اضافہ پیدا کر دیتے ہیں۔

؎ ناروا کہیے ناسزا کہیے

کہیے کہیے مجھے بُرا کہیے

شوخی: داغ کی شاعری میں خوش گفتاری اور ظرافت کے رنگ ملتے ہیں۔ مثلاً مزاح، طنز، طعنہ، گدگدی کے رنگ، وہ بڑی نفاست سے زبان کا چٹخارہ پیش کرتے ہیں۔

؎ راہ پر اُن کا لگا لائے تو ہیں باتوں میں

اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

تکرار الفاظ: داغ تکرار الفاظ سے ایک کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح بات میں زور اور شوخی پیدا ہو جاتی ہے۔

؎ آتی ہے بات بات مجھے یاد بار بار

کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں

معاملہ بندی: جنسی واردات کا بیان یوں تو دوسرے شعراء مثلاً جرأت، انشاء، مومن کے ہاں بھی کثرت سے ہیں لیکن داغ کے ہاں کچھ اور ہی رنگ ہے۔ وہ معاملہ بندی میں شوخی، زندہ دلی اور شرارت کے عناصر بھی داخل کر دیتے ہیں۔

؎ رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں

اِدھر جاتا ہے دیکھیں یا اُدھر پروانہ آتا ہے

مجموعی جائزہ: بقول رام بابو سکسینہ ''داغ میٹھی، سُریلی اور عاشقانہ شاعری کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں۔''

ان کا مرتبہ شعرائے متاخر میں بہت بلند ہے۔ تغزل میں داغ کی شاعری کا اعتراف سب نے کیا ہے۔ حالی لکھتے ہیں

؎ داغ مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں

نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

داغ کا کلام خاص و عام میں مشہور ہے اور اُن کے اشعار پڑھنے والوں پر جادو کا اثر کرتے ہیں اور وہ زبان و بیان کے حسن سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ICMS College System

خواجہ حیدر علی آتش (1764ء تا 1846ء)

آتش کی غزل میں دہلوی اور لکھنوی مزاج کی امیزش ہی نہیں انضمام بھی ہے۔آتش کی رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے وہ دہلی کی تہذیبی اثرات رکھتا تھا۔لیکن اُس کی شخصیت کی تعمیر میں لکھنؤ کی فضا کا بڑا ہاتھ ہے۔آتش بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔اُن کی غزلوں میں تین رنگ ملے جلے نظر آتے ہیں۔ایک رنگ آتش کے مزاج اور قلندرانہ زندگی سے اُبھرتا ہے۔آتش کے کلام کا دوسرا پہلو دہلوی اثرات رکھتا ہے۔آتش دردؔ کی سلسلہ شاعری سے تعلق رکھتے تھے۔آتش کی شاعری کے تیسرے پہلو کو ہم لکھنؤ کے انتخابی رنگ سے یاد کر سکتے ہیں۔یہ وہ رنگ ہے جس کے اختیار کرتے ہوئے بھی آتش نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

ICMS College System

جذبات نگاری: آتش نے اپنے جذبات اور احساسات کو نہایت مؤثر اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔وارداتِ عشق میں سادہ اور روزمرہ کی زبان استعمال کی ہے۔مثلاً۔

؎ پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

؎ ترچھی نگاہ سے طائرِ دل ہو چکا شکار
جب تیر کج پڑے گا اُڑے گا نشانہ کیا

مرصع سازی: آتش کے نزدیک شاعری مرصع سازی ہے۔جس طرح مرصع ساز نگینوں کو جوڑ کر حسن پیدا کرتا ہے اس طرح شاعر الفاظ کی بندش سے یہی کام کرتا ہے۔آتش کے الفاظ بھی لڑی میں پروئے ہوئے نگینوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔

؎ بندشِ الفاظ جڑنے میں نگوں سے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

رنگِ تصوف: خواجہ میر دردؔ کی طرح آتش کی شاعری میں بھی تصوفانہ رنگ پایا جاتا ہے۔انہیں تصوف خاندانی وراثت میں ملی تھی۔جنہیں آتش نے بڑی خوبصورتی سے برتا ہے۔وہ ایک قلندرانہ شان رکھتے ہیں۔

؎ طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے زمانہ کرے گا کیا

؎ نظر آیا تماشا یہ جہاں جب بند کیں آنکھیں
صفائے قلب سے پہلو میں ہم نے جام جم پایا

وارداتِ عشق: آتش نے وارداتِ عشق کو نہایت سادہ اور روزمرہ کی زبان میں پیش کیا ہے۔اس خصوصیت کی بدولت ہر خاص و عام نے آتش کو پسند کیا۔اُن کے یہاں عشق کی کیفیات کا خوبصورت بیان پڑھنے کو ملتا ہے۔

؎ آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تیری محفل میں رہ گیا

؎ نہ جائیں آپ ابھی دوپہر ہے گرمی کی
بہت سی گرد بہت سا غبار راہ میں ہے

جدوجہد کا پیغام: آتش کے کلام میں جدوجہد اور سعی و عمل کا پیغام موجود ہے۔اُن کا خیال ہے کہ حصول مقصد کیلئے انسان کو کوشش کرنی چاہیے۔راستے کی دشواریوں کی پروہ نہیں کرنی چاہیے۔

؎ تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش
گل مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے

؎ سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

نشاطیہ انداز: آتشؔ کی شاعری میں نہ شدید غم ہے نہ لکھنؤ جیسی خوشی اور سرمستی ہے۔اُن کے یہاں مہذب قسم کی زندہ دلی ہے۔

ے بہار گلستان کی ہے آمد آمد
خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

ندرتِ خیال: آتشؔ نے اپنے کلام میں نئے نئے مضامین باندھے ہیں ساتھ ساتھ وہ زبان و بیان کی خوبیوں سے بھی مالامال ہے۔

ے بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خون نہ نکلا

رندانہ مضامین: آتشؔ کی شاعری می رندانہ مضامین بھی ملتے ہیں۔اُن کے یہاں مئے خواری کا جوش اور سرمستی نمایاں ہے۔

ے مگر اُس کو فریبِ نرگسِ مستانہ آتا ہے
اُلٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

مجموعی جائزہ: آتشؔ اپنی غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتوں کی بنا پر اُنہیں اردو شاعری میں ایک بلند مقام حاصل ہے۔وہ ایک صاحبِ طرز شاعر تھے۔ اُن کا شمار اردو زبان کے سنجیدہ شاعروں میں ہوتا ہے۔شعری ضرورت کے مطابق وہ شاعری کے تمام لوازم کو بڑی مہارت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ روزمرہ بول چال کے الفاظ کا استعمال اور رنگینی اُن کے کلام کو دلکشی بخشتی ہے۔اُن کا کلام سچے انسانی احساسات، مشاہدات اور تجربات سے بھرا ہے۔انہی خصوصیات کی بنا پر اُن کے کلام کی قدر و قیمت مسلم ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حکیم مومن خان مومنؔ (1800ء تا 1851ء)

مومنؔ اپنے اندازِ سخن اور اسلوب بیان کے لحاظ سے منفرد شاعر ہیں۔اُن کا مزاج عاشقانہ تھا۔اسلئے انہوں نے غزل کو پوری رعنائی اور نزاکتوں کیساتھ سنوارا ہے۔اُن کے یہاں عشق مجازی ہے۔عشق حقیقی نہیں۔وہ صرف عشقیہ شاعر تھے۔اُن کے یہاں تصوف بھی ناپید ہے۔فلسفے سے انہیں دلچسپی نہیں۔
مومنؔ اسلوب اور قدرتِ بیان کے بادشاہ ہیں۔اُن کی شاعری میں لکھنؤ کا رنگ اور فارسی رنگ غالب ہے۔حسن و عشق کی چاشنی اور منفرد اندازِ بیان نے مومن کی شاعری کو اپنے تمام معصرین سے ممتاز کردیا ہے۔

اسلوبِ بیان: مومنؔ اسلوب بیان اور ندرت بیان میں بڑی قدرت رکھتے ہیں۔وہ معمولی معمولی سی باتوں میں اپنی نازک خیالی، مضمون آفرینی اور شوخی ادا سے لطف سے لطف پیدا کردیتے ہیں۔شبِ فراق کے کربناک لمحوں میں ہر عاشق مرنے کی خواہش کرتا ہے۔لیکن مومن کا انداز نرالا ہے۔

ے شبِ فراق میں بھی زندگی پر مرتا ہوں
کہ گو خوشی نہیں ملنے کی، پر ملال تو ہے

جدتِ ادا: مومنؔ کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے قلبی احساسات کو جہاں تک ہر شخص کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔

ے خواہشِ مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ
دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

ے ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو
عذر کچھ چاہیے ستانے کو

ICMS College System

معاملہ بندی: عشق ومحبت کے معاملات اور واردات کو مومن کبھی کبھی کھل کر بیان کرتے ہیں جن کو شاعری کی اصطلاح میں معاملہ بندی کہا جاتا ہے۔ جن میں چھیڑ چھاڑ کے مضامین شامل ہیں۔لیکن مومن نے پردہ داری سے کام لیا ہے۔

؎ وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو ؎ شکوہ ہے غیر کی کدورت کا

وہ وعدہ یعنی نباہ کا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو سو مرے خاک میں ملانے کو

محبوب کا تصور: اردو غزل میں مومن کا محبوب ایک واضح صورت رکھتا ہے۔انہوں نے پردہ نشین کا لفظ محبوب کیلئے استعمال کر کے ظاہر کیا ہے کہ اُس کا محبوب عورت ہے۔جو شرم وحیاء کا پیکر ہے۔مثلاً

؎ بسکہ پردہ نشین پہ مرتے ہو

موت سے آئے ہے حجاب ہمیں

نزاکتِ خیال: مومن کا طریقۂ بیان کچھ ایسا دلپسند اور مرغوب ہے کہ معمولی معمولی بات بھی جب بیان کرتے ہیں تو وہ انوکھی اور حسین دکھائی دیتی ہے۔

؎ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ؎ مانگا کریں گے اب تو دعا ہجر کی

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

طنز: مومن کے کلام کی ایک خصوصیت لطیف طنز ہے۔جس میں نشتریت محسوس ہوتی ہے۔

؎ میرے آنسو نہ پونچھنا دیکھو

کہیں دامان تنگ نہ ہو جائے

موسیقیت اور روزمرہ محاورات: مومن الفاظ سے موسیقیت پیدا کرنے میں خاصی مہارت رکھتے ہیں۔دوسرے تمام شعراء کی طرح مومن نے بھی حسین الفاظ اور روزمرہ محاورہ کا استعمال برجستہ اور بے ساختہ انداز میں کیا ہے۔

؎ کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چُرا گئے

کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

تخلص کا بامعنی استعمال: مومن تخلص کا معنی خیز استعمال کرتے ہیں۔اُن کے مقطعے شاعری کا قیمتی سرمایہ ہے۔

؎ شب جو مسجد میں جا پھنسے مومنؔ ؎ چل کے کعبہ میں سجدہ کر مومنؔ

رات کاٹی خدا خدا کر کے چھوڑ اس بُت کے آستانے کو

مجموعی جائزہ: درج بالا خصوصیات کی بنا پر مومن کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔مومن کی غزل سنجیدہ معاملہ بند، داخلیت، نازک خیالی اور اسلوب کی جدت سے عبارت ہے۔انہوں نے ایک علیحدہ اسلوب اختیار کیا۔زبان کی سلاست اور ندرت ادا میں انفرادیت برقرار رکھی۔مومن نے نہ صرف زبان کو صاف کیا بلکہ اُسے بھی شستہ بنایا اور یہ تمام خوبیاں مومن کو اپنے دور کا نمائندہ شاعر بناتی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ICMS College System

علامہ اقبال

بیسویں صدی میں اقبال کی شخصیت ایک مہرِ جہاندار کی طرح اُبھری۔جنہوں نے نہ صرف اُمت مسلمہ کے دلوں کو روشن کیا بلکہ پوری عالم انسانیت اُس کی روشنی سے منور ہوگئی۔علامہ اقبال نے دیگر شعراء کی طرح شاعری کا آ گاز غزل سے کیا۔اُن کی شاعری کے جوہر لاہور میں ظاہر ہوئے۔جہاں ادبی ماحول نے طبیعت کو وہ جلا بخشی کہ ذرہ آفتاب بن کر چمکا۔اقبال نے ابتداء میں عشقیہ مضامین کو اہمیت دی۔آگے چل کر اقبال کا تصورِ عشق زماں و مکاں پر حاوی نظر آنے لگتا ہے۔اقبال نے جہاں داغ کا اثر قبول کیا وہاں اُن کا انداز یہ ہے۔

؎ نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی — بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی میں نے
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی — بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

فلسفہ خودی: اقبال کی شاعری کا محور خودی ہے۔جو خود کو پہچاننے کا نام ہے۔چونکہ اُن کا سب سے اہم تصور خودی ہے اسلئے انہوں نے اپنی شاعری کا سارا زور تعمیر خودی پر صرف کر دیا ہے۔خودی سے یہ بھی مراد ہے کہ فرد کی صلاحیتوں کو اُجاگر ہونے کو موقع ملنا چاہیے۔خودی دراصل کلمہ طیبہ ہی کی تفسیر ہے۔ مثلاً

؎ خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے — خودی کیا ہے بیدارئ کائنات

تصورِ مردِ مومن: اقبال کے ہاں مومن کا ایک خاص تصور پایا جاتا ہے۔اقبال کا مردِ مومن بے پناہ قوت کا حامل ہے۔وہ زمین پر خدا کی نیابت کے فرائض انجام دینے کا اہل ہے۔اقبال کا مردِ مومن تمام اعلیٰ خصوصیات کے مالا مال ہے۔

؎ قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان — رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اقبال کا مردِ مومن خدا کی رضا کیلئے جان کا نذرانہ پیش کرتا ہے۔

؎ شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

تصورِ عقل و عشق: یہ اقبال کا پسندیدہ موضوع ہے۔اگرچہ اقبال عقل کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں لیکن عقل کے مقابلے میں وہ عشق کو فوقیت دیتے ہیں اقبال کے ہاں عشق حرکت و عمل، جذبہ، تڑپ اور کوشش کا نام ہے۔

؎ بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق — ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی — حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

مغربی تہذیب پر طنز: اقبال نے مغربی تہذیب کو انتہائی قریب سے دیکھا تھا۔وہ مغربی تہذیب میں پائی جانے والی مادیت، عریانی اور اخلاقی قدروں کی پامالی سے نفرت کرتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے اس کے برے اثرات سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔

؎ تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

تقدیر شکن: تقدیر پرستی ملتِ اسلامیہ کے زوال کا باعث ہے۔اقبال نے تقدیر کو بدلنے کی تلقین کی ہے۔اس سلسلے میں وہ محنت اور کوشش کا درس

ICMS College System

دیتے ہیں۔

؎ تقدیر شکن قوت ابھی باقی ہے اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

موسیقیت: اقبال کو موسیقی کا گہرا شعور حاصل تھا۔ وہ الفاظ کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ ایک طرح کی ترنم پیدا ہو جاتی ہے۔

؎ ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

تشبیہات کا خوبصورت استعمال: اقبال کے ہاں خوبصورت تشبیہات ملتے ہیں۔

؎ جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

نئے الفاظ و تراکیب: اقبال کے ہاں الفاظ کے تراکیب کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ یہ الفاظ زیادہ تر فارسی سے لئے گئے ہیں۔ لیکن اقبال نے اُن کو اردو کا حصہ بنا دیا ہے۔

ضائع بدائع کا استعمال: اقبال کے ضائع بدائع پر علیحدہ ایک کتاب چھپ چکی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کس کثرت سے ان کا استعمال کرتے۔ اس سلسلے میں اقبال بے نظیر ہیں۔

مجموعی جائزہ: علامہ اقبال بڑی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ اقبال نے نظم اور غزل دونوں میں طبع آزمائی کی۔ غزل کے علاوہ تقریباً تمام اصنافِ شاعری میں مضامین حوالہ قلم کیے۔ وہ مصور پاکستان تھے۔ انہوں نے شاعری کو مسلمانوں کی بیداری کا ذریعہ بنایا۔ تاریخ عالم میں یہ واحد مثال ہے کہ ایک شاعر کے افکار کی بدولت ایک مملکت وجود میں آئی۔ اقبال کی غزل شعور کی بلندیوں کو چھوتی ہے۔ مضمون آفرینی، فکر کی گہرائی تخیل کی بلندی اور جذبے کی شدت نے اُن کی غزل کو نیا روپ اور آہنگ عطا کیا۔ قومی و ملی شاعر کی حیثیت سے اقبال ایک نئے دور کا نقیب ہے جس کے اثرات ہمارے ادب پر گہرے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ICMS College System

فیض احمد فیض (1912ء تا 1981ء سیالکوٹ)

فیض نے شاعری کی ابتداء غزل سے کی۔ بعد میں نظم کی طرف متوجہ ہوئے۔ فیض نے رومانوی اور انقلابی دونوں قسم کی شاعری کی۔ اور اس میدان میں اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔

؎ مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

رومانوی شاعری: فیض نے جب میدانِ شاعری میں قدم رکھا تو حسن و عشق کی دنیا آباد نظر آئی۔ شاعر کا نوجوان دل حسن کی طرف مائل ہوا۔ محبوب سے راز و نیاز اور چھیڑ چھاڑ میں اس قدر مگن ہوئے کہ دنیا کو آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی فرصت نہ رہی۔ وہ کائنات کی ہر چیز پر محبوب اور حسن و عشق کو ترجیح دینے لگے۔

؎ رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارا بام پہ آنے کا نام

؎ ویران ہے میکدہ خُم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

مطلب یہ کہ فیض راہ اُلفت کے تمام تجربات بیان کرتے ہیں۔ شاعری کے اس دور میں حسن و عشق، مظاہر پرستی نمایاں ہے۔ ایک تخیلی دنیا ہے جس سے فیض لطف اُٹھاتے ہیں۔

انسان دوستی: پھر ایک دور ایسا آتا ہے کہ شاعر آگے بڑھتا ہے۔ گردوپیش پر نظر ڈالتا ہے۔ تو چونک اُٹھتا ہے۔ اس دور میں انہیں یہ حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ ہر طرف غربت و افلاس، بھوک اور ناداری اور ظلم و ستم کے غریب منہ کھولے نظر آتے ہیں۔ خاک میں لتھڑے ہوئے جسم ہیں۔ اس دور میں فیض کا غم غمِ کائنات میں بدل جاتا ہے۔ وہ پکار اُٹھتا ہے۔

؎ اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

وہی فیض جو رنگ و نور کے دلدادہ تھے اب تلخ مسائل کو موضوع بنانے لگے۔ اور اس کی محبت کا مرکز وطن اور اہل وطن بن جاتے ہیں۔ وہ وطن سے محبوت کی طرح محبت کرنے لگے۔

؎ چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اسکی لگن کو

شاعرانہ حسن: فیض زندگی سے بہت کچھ چاہتے ہیں۔ قید و بند کی صعوبتیں سیاسی جدوجہد میں ناکامی، حالات کی تلخی لیکن ان سب حالات کے باوجود فیض کی شاعرانہ خوبیوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ بلکہ اُن کی شاعری میں باوجود شدت غم کے نغمگی کا احساس ہوتا ہے۔ الفاظ کی ترتیب بے مثال ہے۔ شاعرانہ لوازمات کا خوبصورت انتظام ہے۔ دونوں قسم کی شاعری میں فیض کے ہاں یہ خوبی ملتی ہے۔

؎ متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

؎ اُدھر ایک حرف کہ کشتنی اِدھر لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سن کے اُڑا دیا جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا

مؤثر لب و لہجہ: رومان اور حقیقت کا حسین امتزاج، احساس کی شدت، جذبات کا خلوص، تراکیب کا استعمال اور مخصوص لب و لہجہ فیض کی پہچان ہے۔ وہ اردو اور فارسی اور انگریزی روایات سے اچھی طرح واقف تھے۔ پرانی علامات کو نئے معانی دینا فیض کا کمال ہے۔

ICMS College System

رجائیت: فیضؔ نے اپنی غزلوں اور نظموں میں معاشرتی بے راہ روی اور سماجی عدم مساوات کے خلاف آواز اُٹھائی۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ہر طرف تاریکی اور مایوسی کے سائے پھیلے ہوئے ہیں۔ کہیں سے اُمید کی کرن نظر نہیں آتی۔ پھر بھی وہ اندھیرے میں سرگرمِ عمل ہیں۔

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے ہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

مستقبل کی اُمید افزا اشارے کسی قدر حسین ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد زندگی سے محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ زندگی جدوجہد کا نام ہے اور یہی فیض کی شاعری کا کمال ہے۔

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آ کے دی دستک
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

مجموعی جائزہ: رومانوی شاعری ہو یا انقلابی شاعری فیض دونوں حوالوں سے عظمت کے مینار ہیں۔ جہاں تک عشقیہ شاعری کا تعلق ہے تو وہ عوامی مذاق کے مطابق ہے۔ لیکن انقلابی شاعری میں وہ اوجِ ثریا پر پہنچ گئے ہیں۔ عوامی جذبات کی ترجمانی کرنا فیض کی دوسری قسم کی شاعری کا خاصہ ہے۔ جن کی بدولت وہ مسیحا قوم ٹھہرے۔ حقائق سے آگاہی دلانا اور مقدور بھر مزاحمت کرنا اُن کی زندگی کا مشن تھا۔ جن کی بدولت وہ مدتوں تک دلوں پر راج کریں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حسرت موہانی

حسرت موہانی اردو غزل گوئی میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اردو شاعری میں اُن کی اہمیت مسلم ہے۔ حسرت قدیم غزل سے بھی متاثر تھے۔ یوں اُن کے ہاں اپنی طبع آزمائی کے ساتھ ساتھ اُن کے ہاں تقلید کا اثر بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ حسرت خود اس کی پیروی کا اعتراف کرتے ہیں۔

غالبؔ و مصحفیؔ و میرؔ و نسیمؔ و مومنؔ
طبعِ حسرتؔ نے اُٹھایا ہر اُستاد سے فیض

حسرت کی شاعری کا محور: حسرت کے اس رجحان پر مذاق لکھتے ہیں کہ حسرت کے اشعار حسن و عشق کے بیان میں مصحفی کی یاد دلاتے ہیں۔ معاملہ بندی میں جرأت داخلی و نفسیاتی اُمور میں مومنؔ کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ لیکن ان سب رنگوں سے ممتاز اُن کا اپنا انفرادی انداز ہے۔ حسرت کی غزل میں ایک ذہنی گدگدی، ایک داخلی کیفیت نظر آتی ہے۔ حسرت کی شاعری معاملاتِ حسن و عشق تک محدود رہی۔

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ اُلفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

تصورِ عشق: حسرت کا تصورِ عشق بازاری نہیں گھریلو ہے جس میں پیار کی باتیں ہیں۔ نارانگی ہے، اشارے اور کنایے ہیں۔ مختصراً عشق کا ہر معاملہ اُن کے ہاں موجود ہے۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

توڑ کر عہدِ کرم ناآشنا ہو جایئے
بندہ پرور جایئے اچھا خفا ہو جایئے

ICMS College System

تصورِ محبوب: حسرت کا محبوب صنفِ لطیف ہے۔ وہ عورت ہے جس کا دل بھی ہے اور جذبات بھی ہیں۔ وہ نورِ حسرت کیلئے بے چین ہے۔ اُس میں خلوص ہے۔

بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے ~~~~ وہ جو بگڑے رقیب سے حسرتؔ
ہاتھ آہستہ میرا پھر بھی دبا کے چھوڑا ~~~~ اور بھی بات بن گئی دل کی

فلسفیِ عشق: حسرتؔ عشق کو بہت بلند مرتبہ دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ خاص جذبہ ہے اور خاص دلوں کیلئے ہے۔ اُن کے نزدیک عشق کی بدولت انجمنِ ہستی بے رونق ہے۔

حسرتؔ بہت بلند ہے مرتبہ عشق
کچھ کو تو مفت لوگوں نے بدنام کیا

معاملہ بندی: تنہائی میں محبوب سے چھیڑ چھاڑ اور معاملات کا شاعری میں ذکر کرنا معاملہ بندی کہلاتا ہے۔ حسرتؔ کے ہاں معاملہ بندی سلجھی ہوئی شکل میں نظر آتی ہے۔

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف ~~~~ بار بار اُٹھنا اُسی جانب نگاہِ شوق کا
وہ راتوں کو تیرا چوری چھپے آنا یاد ہے ~~~~ وہ تیرا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے

حسن پرستی: حسرتؔ کا محور محبوب اور حسن و عشق ہے۔ وہ حسن کی عکاسی کرتے ہیں۔

سر کہیں، بال کہیں، ہاتھ کہیں، پاؤں کہیں
اُس کا سونا بھی ہے کس شان کا سونا دیکھو

مجموعی جائزہ: حسرتؔ نے قدیم اور جدید نظریات کے امتزاج سے قاری کو متاثر کیا۔ اُس کی شاعری میں حسن اور رعنائی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے معاملاتِ عشق بڑے مزے سے بیان کئے ہیں۔ اپنی خصوصیات کی بنا پر اُن کا مرتبہ بلند ہے۔

لکھتا ہوں مرتب، نہ قصیدہ نہ مثنوی
حسرتؔ غزل ہے صرف میری جانِ عاشقانہ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ICMS College System

احمد ندیم قاسمی

ندیم صاحب کی شاعری کا آغاز پندرہ برس کی عمر میں ہوا۔کسی سے شاگردی کا شرف حاصل نہیں کیا۔بقول ندیم ''آج تک جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ میرا اپنا سرمایہ ہے۔میری آنکھوں،میرے دل اور میرے دماغ کا خزانہ ہے۔جس پر کسی دوسرے کا اثر نہیں۔البتہ ماحول کے اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔میں اپنی شاعری اور افسانہ نگاری کا خود ہی خالق ہوں۔''

احمد ندیم قاسمی نے غزل،نظم،قطعہ،رباعی غرضیکہ ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کے کلام میں شدید احساس،حالات کا صحیح تجزیہ،حیات انسانی کی حقیقی ترجمانی خلوص وصداقت اور اسلوب کی پختگی ہے۔ان خصوصیات نے مل جل کر ان کے کلام کو نہ صرف ایک نیا رنگ وآہنگ دیا ہے بلکہ اسے عظیم شاعری کی ان سرحدوں کے قریب پہنچایا ہے۔ جہاں شعر ایک ابدی حقیقت کی صورت میں اختیار کر لیتا ہے۔

ندیم کے 4 مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔پہلے دو مجموعے ''جلال وجمال'' اور ''شعلہ وگل'' نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔''رم جھم'' میں قطعات ہیں۔ چوتھا مجموعہ ''دشت وفا'' ہے۔جس پر انہیں آدم جی انعام بھی مل چکا ہے۔

ندیم کی شاعری میں ایک ترقی پذیر سوسائٹی کا ذہن کارفرما نظر آتا ہے۔وہ دور حاضر کے رجحانات کے صحیح معنوں میں علمبردار ہیں اور اولوالعزمی اور جواں ہمتی ان کے کلام کا خاصہ ہیں۔وہ انسانیت کے دکھ درد پر آنسو ضرور بہاتے ہیں۔لیکن حالات سے مقابلہ کرنے اور دن پھیر دینے کا حوصلہ بھی دیتے ہیں۔

؎ جتنے چھبتے ہیں پاؤں میں کانٹے
حوصلہ اور بھی بڑھ رہا ہے

ان کے نزدیک ایک شاعر،شاعر ہونے کے علاوہ انسان بھی ہے۔لہٰذا اسے انسان کی عظمتوں کو پا لینے کی کوشش کرنا بھی فرض ہے۔وہ اپنے فن کی لطافتوں سے ایسی شخصیت فروزاں کرنے کے خواہاں ہیں۔جو زندگی کو تابندگی بخشیں۔ندیم کی فطری افتادِ طبع انہیں انسانیت کے دکھ درد میں شریک ہونے اور اسے نئی بلندیوں تک پہنچانے کی سعی کے میدان میں کھلتی نظر آتی ہے۔اپنی غزلوں میں بھی اکثر غم جاناں چھوڑ کر غم دوراں لے بیٹھتے ہیں۔

؎ جو پیار نہ کر سکے زمیں سے پائیں گے نہ بھیک آسماں سے

اس نظریہ اور مخصوص افتادِ طبع کے باوجود ندیم نے خالص تغزل کے مرقعے پیش کیے ہیں۔

؎ شام کو صبح چمن یاد آتی ہے جب خیالوں میں کوئی موڑ آیا
کس کی خوشبوئے بدن یاد آئی تیرے گیسو کی شکن یاد آئی

ایک اور پہلو اُن کی آفاقی انسان دوستی ہے۔وہ فیض کی طرح پوری انسانیت کے دکھ کو سینے میں چھپائے ہوئے ہیں۔

؎ وہ محبت کا پجاری ہوں عقیدوں کا نہیں ان بتوں کو مرے رستے سے ہٹایا جائے

اُن کی شاعری ظلم واستحصال کے خلاف ہے وہ اپنے دور کے فنکاروں کو ان خطرات سے آگاہ کرتے ہیں۔اور انہیں اپنا فرض یاد دلاتے ہیں۔یہی ان کی رجائیت پسندی کی آخری اُمید گاہ ہے۔

؎ ان بھیانک جلی چٹانوں میں زندگی کا سراغ پاؤں گا
ہم سفر تو ٹھہر سکے تو ٹھہر میں تو ان چوٹیوں پر جاؤں گا

ہر طرف چھا رہی ہے تاریکی
آؤ مل جل کر ذکرِ یار کریں

ICMS College System

ICMS College System